© rasailojaraid.com



# نیا ایمان

ابو الحسن علی ندوی

ایک چیز ہے دین 'اور ایک ہے ایمان- ان دونوں میں ایک فرق ہے- دین تو وہ نظام ہے جس کو لے کر تمام انبیا آتے رہے' اور جس کا آخری پیغام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر تشریف لائے' اور اللہ تعالیٰ نے آپ ؐ کے ذریعہ اس دین کو مکمل فرمایا- دین تو یقیناً مکمل ہو چکا- لیکن دوسری چیز ہے اس دین پر یقین کرنا' اور اسی دین کی حقیقتوں پر ایمان لانا- اس میں کسی اضافہ کی دعوت نہیں دی جا سکتی- اس میں جس طرح کچھ گھٹایا نہیں جا سکتا' بڑھایا بھی نہیں جا سکتا- لیکن ایمان کا معاملہ یہ نہیں ہے- اس میں زیادہ سے زیادہ ترقی کی گنجائش ہے- اس لیے ایمان میں تازگی اور زیادتی کی دعوت قیامت تک جاری رہے گی- ضروری ہے کہ دین پر اپنے ایمان ویقین کو مضبوط کرنے' اس کو اپنی زندگی بنانے' اور ہر چیز کو اس پر قربان کرنے اور اس کو کسی چیز کے عوض ہاتھ سے نہ دینے کی کوشش برابر جاری رہے- اس امت کی ہر نسل' ہر حصے اور ہر دور کے لیے اس دین پر نیا ایمان لانا ضروری ہے-

آنحضرت ؐ کی بعثت کے وقت دین کا وجود بالکل ختم نہیں ہو چکا تھا- قدیم مذاہب و ادیان کی بہت سی شکلیں اور صورتیں موجود تھیں' لیکن دین میں کوئی طاقت باقی نہیں رہی تھی- لوگوں کا ان حقیقتوں پر تو ایمان ویقین تھا کہ سانپ کا زہر قاتل ہے' ہوا زندگی کے لیے ضروری ہے' کھانے سے پیٹ بھرتا ہے' لیکن اس پر ایمان نہیں تھا کہ دوزخ کی آگ کیسی خطرناک ہے اور جنت کا آرام اور اس کی راحتیں کیسی قابل رشک ہیں- ان کا ایمان نہیں تھا کہ اللہ کو ناراض کر کے وہ فلاح پا سکتے ہیں درآنحالیکہ ان کا نوکر ان کی نافرمانی کر کے ان کے گھر میں نہیں رہ سکتا تھا- ان کا ایمان تھا کہ آگ کی ایک چنگاری گھروں کو خاک سیاہ کر سکتی ہے- لیکن ان کا ایمان نہیں تھا کہ گناہ و ظلم سے بستیاں اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



ملک تباہ ہو سکتے ہیں۔ ایک طبیب کی باتوں پر وہ جتنا اعتماد کرتے تھے، رسولؐ کی باتوں پر اتنا بھی اعتماد نہیں تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ان کا تعلق دین اور دوسری زندگی سے مردہ ہو چکا تھا، اور انھیں اس سے کوئی دلچسپی باقی نہ رہی تھی۔ صرف دنیا کی زندگی اور اس کی دیکھی بھالی اور آزمائی ہوئی حقیقتیں ان پر چھائی ہوئی تھیں۔

کچھ ایسا ہی حال اب ہمارا ہو گیا ہے۔ اگر اس وقت کوئی یہاں آ کر کہہ دے کہ عجائب گھر سے شیر چھوٹ گیا ہے تو آپ دیکھیں گے کہ یہ پورا مجمع اسی طرف متوجہ ہو جائے گا، اور سب کو اپنی اپنی فکر پیدا ہو جائے گی۔ اجتماع کا سارا سکون، انتشار سے بدل جائے گا، کیونکہ ہماری زندگی ہمارے اوپر حاوی ہے۔ جب کوئی خطرہ زندگی کو چیلنج کرتا ہے تو ہماری قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں، اور زندگی کے لیے محافظ بن جاتی ہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص اس زندگی کے خطرات سے آپ کو آگاہ کرے، جو ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی ہے، اور جس میں تکلیف ہے تو دوامی اور آرام ہے تو دوامی اور غیر فانی، تو ہم نہایت بے توجہی اور بے فکری سے سن لیں گے۔ اس کا سبب بے دینی نہیں ہے، بلکہ دین پر ایمان کی کمی اور کمزوری، اور ایک طرح کی بے یقینی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایمان کی اس درجہ کمزوری کے ساتھ ایک ایسی زندگی سے کیسے دلچسپی ہو سکتی ہے، اور کیسے اس کے خطرات کی فکر پیدا ہو سکتی ہے جو بالکل آڑ اور اوٹ میں ہے۔

آنحضرتؐ کو جب اللہ تعالیٰ نے اپنا رسول بنایا، اس زمانہ میں عرب میں ایک دستور یہ تھا کہ اگر کوئی قبیلہ کسی دوسرے قبیلہ پر حملہ آور ہوتا، اور اس قبیلہ کا کوئی شخص حملہ آور لشکر کو اس وقت دیکھ لیتا جب وہ بالکل سر پر پہنچ چکا ہوتا، تو وہ شخص دوڑ کر پہاڑ پر چڑھ جاتا اور بالکل برہنہ ہو جاتا، اور دہائی دیتا۔ اس شخص کو النذیر العریان کہا جاتا تھا۔ اس کا یہ فعل اس بات کی علامت ہوتی کہ دشمن بالکل سر پر آ پہنچا ہے، اور جس حال میں بھی ہو اسی حال میں مقابلے کے لیے کھڑے ہو جاؤ۔

اسی دستور کے مطابق آنحضرتؐ ایک دن ایک پہاڑ پر چڑھ گئے، مگر آپ کپڑے پہنے رہے اور پکارا انا النذیر العریان۔ مکہ والے آپؐ کی صداقت اور شرم و حیا کے معترف تھے، اس لیے سارا شہر آناً فاناً کام کاج چھوڑ کر پہاڑ کے دامن میں جا جمع ہوا۔ انھوں نے اتنی توجہ اور فکر سے اس لیے کام لیا تھا کہ حضورؐ کے اس فعل کو انھوں نے اپنی زندگی کے لیے ایک خطرے کی علامت سمجھا تھا۔ وہ سمجھے تھے کہ کوئی دشمن حملہ آور ہو رہا ہے، جس کی اطلاع یہ ہمیں دیں گے۔ جب حضورؐ نے فرمایا، کہ اگر میں تم سے کہوں کہ پہاڑ کے پیچھے دشمن کا لشکر چھپا ہوا ہے جو تمھاری گھات میں ہے، تو کیا تم مجھے سچا سمجھو گے؟ حالانکہ تم اسے نہیں دیکھ رہے ہو، مگر میں چونکہ اوپر کھڑا ہوں اس لیے میری نظر اور اس کے درمیان کوئی آڑ نہیں ہے۔ سب نے کہا، بیشک، ہم آپؐ کی تصدیق کریں گے۔ مگر جب آپؐ نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



فرمایا کہ وہ لشکر 'عذاب الٰہی کا لشکر ہے' جو بالکل سر پر کھڑا ہوا ہے' میری بات مانو تو اس کے حملہ سے بچ سکتے ہو۔ یہ سن کر ان کی ساری توجہ اور ساری فکر ختم ہو گئی۔ وہ پچھتائے 'اور کہنے لگے کہ کیا آپ نے یہی بات سنانے کو ہمیں یہاں بلایا تھا؟... یہ کیا بات تھی؟ ان پر بس اپنی دنیا کی زندگی چھائی ہوئی تھی اس کے ہر خطرے پر ان کے کان کھڑے ہو جاتے تھے 'مگر دوسری زندگی کا انھیں خیال نہ تھا' اس لیے اس کے خطرات کی انھیں مطلق فکر نہ ہوتی تھی۔

آنحضرتؐ کے زمانہ میں مختلف مذاہب موجود تھے اور وہ ایمان کے مدعی تھے 'مگر ان کے ماننے والوں کا ایمان اتنا بے جان اور بوسیدہ ہو گیا تھا کہ محض فرضی اور خیالی تکالیف کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتا تھا' اور ان کی مرغوب معصیتیں اور بد اخلاقیاں نہیں چھڑا سکتا تھا۔ ان کے پاس دین تو موجود تھا مگر ایمان کی طاقت اور تازگی کھو جانے کی وجہ سے 'وہ دین چھوٹے چھوٹے حوادث کا مقابلہ کرنے کے لیے بھی انھیں آمادہ نہیں کر سکتا تھا۔

لیکن رسول اللہؐ کے لائے ہوئے دین پر سچے دل سے ایمان لانے والوں کا حال ان لوگوں سے بالکل مختلف تھا۔ انھیں اس زندگی سے زیادہ دوسری زندگی سے دلچسپی تھی' اس کی فکر تھی۔ ان کا دین ان سے بڑی سے بڑی قربانی بہ آسانی کرا لیتا تھا' اس لیے کہ دین اور دینی حقیقتوں پر ان کا ایمان تازہ اور نہایت جاندار تھا۔ دوسرے مذاہب کے ٹھیکیداروں اور ان سچے دین داروں میں ایسا فرق تھا' جیسا کاغذ کی تصویر اور ایک زندہ انسان میں' یا آگ کی تصویر اور خود آگ میں۔ نئے ایمان نے صحابہ کرامؓ کی رگ رگ میں وہ آگ بھر دی تھی کہ مقابلے میں آنے والے' جو اس ایمان سے محروم تھے' مومی تصویروں کی طرح پگھل جاتے تھے' یا اپنی خیر مناتے ہوئے سامنے سے ہٹ جاتے تھے۔ ان کی تلواروں میں لوہے کی گرمی نہ تھی' بلکہ ان کے ایمانوں کی گرمی تھی۔ وہ فاقہ کش اور خرقہ پوش مجاہد ہتھیار کی طاقت پر نہیں بلکہ ایمان کی طاقت پر لڑتے تھے اور دشمنوں کے چھکے چھڑا دیتے تھے۔ ان کا یقین تو یہ تھا کہ اگر ساری دنیا کی تلواریں ہماری گردنوں پر پڑیں 'مگر اللہ کا حکم نہ ہو تو ہمیں کوئی نہیں مار سکتا۔ جبکہ ان کے مقابل یہ یقین رکھتے تھے کہ تلوار کا ایک ہی وار ہمارا خاتمہ کر دے گا۔ اس نئے ایمان کی طاقت نے ان غریب عربوں کے دل میں سے ان کی کمزوری کا احساس بالکل نکال دیا تھا۔ ایران کے دربار میں جب ان کے سفیر گئے تو ان کی تلواروں پر چیتھڑے لپٹے ہوئے تھے' اور گھوڑے پست قامت تھے۔ مگر ان کا ایمان شعلہ زن تھا اور ان ہی کی طاقت ساری طاقتوں پر غالب تھی۔ یہی طاقت تھی' جس سے سپہ سالار ایران رستم بھی لرزاں تھا' اور ایران کے سارے درباری بھی اپنی اپنی فکر میں پڑے ہوئے تھے۔ ان کی اسی قوت نے انھیں اس قدر جری اور نڈر بنا دیا تھا کہ ان کے درباروں میں قالینوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



پر گھوڑوں کو لیے ہوئے چلے جاتے اور تخت پر نیزہ گاڑ دیتے تھے۔

اسی ایمان کا فرق تھا کہ حضورؐ کی بعثت کے وقت اگر نمازیں تھیں بھی تو خشوع و خضوع نہ تھا' اور اگر حج تھا' تو اس کی روح نہ تھی۔ لیکن جو لوگ حضورؐ کی دعوت پر ایمان لے آئے' ان میں آپؐ نے ایسا ایمان پیدا فرمایا کہ' حج و نماز کے وقت کے علاوہ بھی' وہ ان پر چھایا رہتا تھا۔ اور وہ گویا ہر دم خدا اور آخرت کو اپنی آنکھوں کے سامنے پاتے تھے۔ اسی دنیا میں جنت کی خوشبوئیں تک محسوس کر لیتے تھے۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ میدان جنگ میں اپنے ایک صحابی کے متعلق' ایک دوسرے صحابی سے حضورؐ نے فرمایا' کہ جاؤ ذرا فلاں کا پتا چلاؤ' کس حال میں ہیں۔ (یعنی صحیح سلامت ہیں یا خدانخواستہ زخمی پڑے ہیں' یا جان بحق ہو گئے)۔ انھوں نے ایک جگہ دیکھا' زخمی پڑے ہوئے ہیں اور تقریباً وقت آخر ہو رہا ہے۔ کہا: "حضورؐ نے حال دریافت فرمایا ہے۔" جواب دیا: "جاؤ' میرا اسلام عرض کرنا' اور عرض کر دینا کہ حضورؐ' جنت کی خوشبوئیں آ رہی ہیں۔" حضرت ابوہریرہؓ کا واقعہ ہے کہ وہ مرض الوفات کی سخت تکلیف میں مبتلا تھے' بیوی قریب بیٹھی تھیں۔ تکلیف کی شدت دیکھ کر ان کے منہ سے نکلا' واکرباہ! حضرت ابوہریرہؓ کی جب ذرا طبیعت سنبھلی' فوراً بولے: "کیا کہتی ہو؟ واکرباہ، نہیں' واطرباہ! واطرباہ! غدا القی الاحبۃ محمد او حزبہ (واہ کیا خوشی کا موقع ہے' کیا نشاط کا عالم ہے' کل ہم دوستوں سے ملیں گے' محمدؐ اور آپؐ کی جماعت سے ملیں گے)"۔

غرض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دین کی حقیقتوں پر ایسا یقین تھا کہ ہمیں محسوسات و مشاہدات پر بھی ویسا یقین نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی' کہ ان کا ایمان نیا اور تازہ تھا' اور ہر نئی اور تازہ چیز میں ایک قوت اور شادابی ہوتی ہے۔

حضرت ابوذر غفاریؓ جب حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام لائے' تو اس کا جوش پیدا ہوا کہ حق کا اعلان اور اظہار کروں۔ آپ نے بیچ حرم میں جا کر بلند آواز سے کلمہ پڑھا۔ کفار چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے' اور خوب زدوکوب کیا۔ مگر ان کو وہ لذت ملی کہ دوسرے دن پھر جا کر یہی کام کیا اور پھر پیٹے گئے۔ یہ دراصل ان کے ایمان کی تازگی تھی۔ ان کا نیا اور تازہ ایمان' دین کی راہ میں دنیا کی ہر تکلیف کو حلاوت و لذت سے بدل دیتا تھا۔

حضرت عبداللہ ذوالبجادینؓ اسلام لانے سے قبل اپنے والد کے فوت ہو جانے کی وجہ سے اپنے چچا کے پاس رہا کرتے تھے' اور انھی کا کام کاج کیا کرتے تھے' ان کی بکریاں وغیرہ چرانے لے جاتے تھے۔ کانوں میں اسلام کی آواز پہنچ چکی تھی۔ ایک دن تہیہ کر لیا کہ آج محمد صلی اللہ علیہ وآلہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



وسلم کی خدمت میں جاکر اسلام لے آتا ہے۔ چچا کے پاس آئے' بکریوں کا ریوڑ ان کے حوالہ کیا' اور کہا' میں اب اس ذمہ داری سے سبکدوش ہونا چاہتا ہوں' اسلام قبول کرنے جا رہا ہوں۔ چچا نے کہا: "بدن پر جو کپڑے ہیں اتارتے جاؤ۔" ظالم نے بالکل برہنہ کر کے چلتا کر دیا۔ کسی نہ کسی طرح والدہ کے پاس پہنچے' اور پہننے کے لیے کپڑا مانگا۔ انھوں نے ایک کمبل دیا' جس کے دو ٹکڑے کر کے ایک اوڑھا' ایک باندھا' اور حضورؐ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ پھر بقیہ زندگی آپ کے قدموں میں گزار دی۔ ذوالبجادین ؓ کا لقب آپؐ نے ان کے دو کمبلوں کی وجہ سے دیا تھا۔

نیا اور تازہ ایمان' اس زندگی کو بالکل بے وقعت بنا دیتا ہے' اور اس کو قبول کرنے والا فوراً داعی و مجاہد بن جاتا ہے۔ ایک جنگ کے موقع پر رومیوں کی صف سے ایک بہادر نکلا اور اس نے حضرت خالدؓ کو پکارا۔ آپ گئے۔ اس نے بجائے لڑنے کے اسلام کے متعلق کچھ سوالات شروع کر دیے' اور آخر میں دریافت کیا کہ تمھارے دین میں داخل ہونے کا طریقہ کیا ہے۔ آپ نے سب سوالات کے جوابات دیے' اور اپنے خیمہ میں آئے' وہاں اسے غسل کرایا اور کلمہ پڑھایا۔ اس نے دو رکعت نماز پڑھی اور پھر میدان جنگ میں واپس آیا اور اللہ کی راہ میں بڑی بہادری اور بے جگری سے لڑ کر شہید ہو گیا۔ یہ تھی' نئے اور تازہ ایمان کی کشش' کہ حضرت خالدؓ بیچ میدان جنگ میں سے ایک دشمن کو اسلام کا خادم بنا کے لے آئے' اور اس نے اسلام قبول کرتے ہی اپنی زندگی اس پر نثار کر دی۔

آج کی ضرورت' دراصل ایمان کی اسی اصل طاقت کو حاصل کرنے کی دعوت ہے۔ ایسا ایمان پیدا کرنے کی دعوت' جس سے ہمارے متعلقین اور ہمارے احباب بھی ایک خوشبو محسوس کریں۔ پھول میں اگر خوشبو ہوتی ہے تو ضرور محسوس ہوتی ہے۔ آگ میں جب گرمی ہوتی ہے تو ضرور محسوس ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر ہمارے ایمان میں خوشبو ہو' گرمی ہو' تو اس سے دوسرے ضرور متاثر ہوں گے' ورنہ دوسروں کی شکایت اور غیروں کے شکوے بیکار ہیں۔

حمص میں مسلمانوں کا غلبہ ہوا' اور وہاں جزیہ وصول کیا گیا۔ مگر تھوڑے ہی دن بعد خلیفہ وقت کے حکم سے اس جگہ کو چھوڑ کر جانا پڑا' تو جزیہ کی ایک ایک پائی کا حساب کر کے واپس کیا گیا۔ یہ ان کے ایمان کا اثر تھا۔ حمص کے یہودیوں اور عیسائیوں نے اس سے ان کے ایمان کی خوشبو محسوس کی۔ چنانچہ جب مسلمان رخصت ہو رہے تھے' تو وہ لوگ روتے تھے' اور دعائیں کرتے تھے' کہ اللہ تم کو پھر واپس لائے۔ اسی طرح اگر ہمارے اندر کوئی ایمانی طاقت' کوئی اندرونی قوت' اور اخلاقی برتری ہو' تو ناممکن ہے کہ دوسرے انسان اس کو محسوس نہ کریں۔

مسلمانوں کے پاس سرمایہ' علم' تمدن اور دوسری دولتوں کی کمی نہیں ہے۔ اصل میں جو کمی ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



اور جس سے لوگوں کی نگاہیں بدل گئیں اور مسلمان دنیا کی نظروں سے گر گئے وہ ایمان کی تروتازگی اور شادابی کی کمی ہے۔ اس کمی کا اثر آج ہی نہیں' اسی وقت ظاہر ہو گیا تھا' جب مسلمان صاحب اقتدار و حکومت بھی تھے۔ بنی امیہ کے عہد میں حکومت کی طرف سے' ایک غیر مسلم باج گزار ریاست میں جزیہ کی رقم وصول کرنے کے لیے' محصل گئے۔ یہ پہلا موقع تھا جب اسلامی حکومت کے محصل حکومتی کروفر کے ساتھ وہاں گئے تھے۔ والی ریاست نے کہا: "وہ اللہ کے بندے کہاں ہیں جو پہلے آیا کرتے تھے' جو گھاس کے چپل پہنے ہوئے تھے' جن کے چہروں سے فاقہ کشی اور کپڑوں سے غربت ٹپکتی تھی۔" اس کو بتلایا گیا کہ وہ تو اگلے زمانہ کے مسلمان تھے' اب وہ کہاں۔ اس نے کہا: "اب ہم ایک پیسہ خراج کا نہیں دیں گے۔ ہم نے اب تک ان سے مرعوب ہو کر خراج دیا تھا۔ وہ جس وقت کہتے تھے کہ اللہ کے بندے' اللہ کا مطالبہ دے تو ہم ان کی بات کو رد نہیں کرتے تھے' لیکن تم سے مرعوب ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ تمھارا جو جی چاہے' کر لو"۔

دنیا کو آج اس تروتازہ ایمان کی شدید ضرورت ہے' مگر یہی ضروری چیز دنیا سے ناپید ہو گئی ہے۔ آج یورپ کے کارخانوں نے دنیا کی ہر ضروری' بلکہ غیر ضروری چیز بھی بنا ڈالی ہے' جسے ہر ضرورت مند بازار سے خرید سکتا ہے۔ مگر وہ چیز جس کو پیدا کرنے سے یورپ کے کارخانے بھی عاجز ہیں' یہی خالدؓ و ابوذرؓ کا ایمان ہے۔

© rasailojaraid.com